اکیسواں خط

عید میلاد النبیؐ

سلیم بیٹا! اللہ تمہیں خوش رکھے اور تمہارے ذوقِ قرآنی میں برکت عطا فرمائے۔ رفتہ رفتہ تمہاری نگاہ کس قدر صاف اور تمہاری بصیرت کس قدر نورانی ہوتی جاتی ہے۔ قرآن کو غور و فکر سے سمجھنے کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔ وہ خود نور (روشنی) ہے اور انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔

جیسا کہ میں نے تمہیں ایک مرتبہ پہلے بھی لکھا تھا (اور یہ غالباً شروع ۱۹۵۳ء کی بات ہے)، میرے نزدیک دنیا کے لئے جشنِ مسرت کی تقریبات دو ہی ہیں۔ ایک نزولِ قرآن کی عید اور دوسری عید میلاد النبیؐ۔ اور یہ دونوں تقریبات بھی ایک سکہ کے دو رُخ اور ایک ہی اصل کی دو شاخیں ہیں، اس لئے کہ نہ رسول اللہؐ کو قرآن سے الگ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی قرآن کو رسول اللہؐ سے جدا۔ قرآن، قلبِ محمدیؐ پر نازل شدہ وحیِ خداوندی کا نام ہے اور رسول اللہؐ قرآنی سیرت کے درخشندہ پیکر۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے صرف احکام و قوانین ہی عطا نہیں کئے بلکہ سیرتِ محمدیہؐ کے اصولی گوشوں کو بھی اپنے دامن میں محفوظ کر لیا ہے۔

تم نے پوچھا یہ ہے کہ رسالتِ محمدیہؐ کا مقصود کیا ہے؟ اس نے نوعِ انسان کو کیا دیا ہے؟ اس کا وہ کونسا کارنامہ ہے جس کی وجہ سے حضورؐ کا اسمِ گرامی محسنینِ عالمِ انسانیت کی فہرست میں سرِ عنوان چمکتا دکھائی دیتا ہے؟ اس سوال کے تفصیلی جواب میں تو ضخیم مجلدات لکھی جاسکتی ہیں (اور خود میری کتاب "معراجِ انسانیت" بھی اسی سوال کے جواب کی کوششِ ناتمام ہے) لیکن قرآن نے ان تمام تفاصیل کو جس حسن و خوبی سے ایک فقرہ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے جب نگہِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے تو اس پر والہانہ وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ سورۂ اعراف میں بعثتِ محمدیؐ کی غایت و مقصود کا ذکر کرتے ہوئے قرآن نے کہا ہے کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي

كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷)۔ وہ نوعِ انسان کے سر سے تمام بوجھ اُتار کر رکھ دے گا جس کے نیچے وہ دبی ہوئی چلی آ رہی ہے اور ان تمام زنجیروں کو توڑ دے گا جن میں وہ جکڑی ہوئی ہے۔ یہ ہے سلیم! بعثت محمدیہ کی وہ عظیم غایت، جسے قرآن نے اس ایجاز و اختصار سے ان چند الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ تم اگر غور کرو گے تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ جائے گی کہ رسالتِ محمدیہ ایک حدِ فاصل ہے، زمانہ قدیم اور دورِ جدید میں۔ اس سے پہلے کی انسانی تاریخ دراصل ایک مسلسل داستان ہے ان گراں بار سلوں کی جن کے نیچے انسانیت بُری طرح دب رہی تھی اور ان اطواق و سلاسل کی جن میں اس کا بند بند جکڑا ہوا تھا، بایں نمط کہ وہ اپنی مرضی سے ایک قدم بھی اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ زنجیریں وہ تھیں جن میں انسان کا دل اور دماغ دونوں ماخوذ تھے۔ ان سے نہ اس کے ذہن میں صحیح فکر پرورش پا سکتی تھی، نہ ہی اس کے سینے میں حسین و خوشگوار جذبات کی بالیدگی ممکن تھی۔ قصۂ بنی اسرائیل میں دیکھو، قرآن نے ان مسیطرانِ نوعِ انسانی کا تذکرہ کس شرح و بسط سے کیا ہے جو انسانی قلب و دماغ پر بُری طرح مسلّط رہتے ہیں۔ فرعون، استبداد و ملوکیت کا مجسّمہ (کہ جس کا نام آج تک بطور ضرب المثل استعمال ہوتا ہے) ہامان، مذہبی پیشوائیت کی دسیسہ کاریوں کا نمائندہ (جس کی سحر کاری کی بنیاد پر قصرِ فرعونیت استوار تھا) اور قارون، سرمایہ داری کی لعنت کا نمائندہ (جس نے خود اپنی قوم کے لہو کا آخری قطرہ تک چوس لیا تھا)۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان میں سے ہر سنگِ گراں انسانیت کی ہڈیاں توڑ دینے کے لئے کافی تھا۔ لیکن جس انداز سے مذہبی استبداد اس کے دل و دماغ پر مسلّط ہو رہا تھا اس کی مثال دوسرے شعبوں میں بھی نہیں مل سکتی تھی۔ رسالتِ محمدیہ کا سب سے بڑا معرکہ آرا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے فکرِ انسانی کو ان زنجیروں سے آزاد کیا۔ اس مقام پر شاید تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ اسلام تو خود ایک مذہبی تحریک (RELIGIOUS MOVEMENT) ہے۔ اس لئے اس نے انسان کو "مذہب" کے چنگل سے کس طرح چھڑا دیا؟ اگر کوئی دہریہ (ATHEIST) یہ کہے کہ میں نے فکرِ انسانی کو مذہب کی گرفت سے آزاد کرایا ہے تو اس کا یہ دعویٰ قابلِ فہم ہو گا۔ لیکن ایک مذہبی تحریک کا یہ دعویٰ کس طرح قابلِ پذیرائی سمجھا جا سکتا ہے؟ تمہارے دل میں اس خیال کا پیدا ہونا بجا ہے۔ لیکن حقیقت وہی ہے جس کی طرف میں نے اُوپر اشارہ کیا ہے۔ یہ مقام ذرا مشکل ہے۔ اس لئے اسے غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

مذہب کی دنیا میں بنیادی تصوّر خدا کا ہے۔ اس تصوّر کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ کسی قوم میں جس قسم کا خدا کا تصوّر ہو گا اسی کے مطابق اس قوم کی تہذیب و معاشرت اور ذہنیت اور نفسیاتی کیفیت ہو گی۔ (خدا کے صحیح تصوّر کے متعلق میں ایک سابقہ خط میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ اس وقت اتنا سمجھ لینا کافی ہو گا کہ

رسالتِ محمدیہؐ سے پہلے، مذاہب کی دنیا میں[1] خدا کا تصوّر ایک مستبد اور مطلق العنان حکمران کا سا تھا، جو نہ کسی قاعدے کا پابند تھا نہ قانون کا۔ جس کے ہاں نہ کوئی آئین تھا نہ دستور۔ وہ جو جی میں آئے کرتا تھا اور جس قسم کا جی چاہے حکم دے دیتا تھا۔ دنیا کے عام شاہنشاہوں کی طرح اس کی بھی یہ کیفیت تھی کہ (سعدی کے الفاظ میں) گاہے بہ سلامے بر بخند و گاہے بہ دشنامے خلعت بہ بخشند۔ اس کے ہاں سے بطورِ استحقاق کچھ طلب کرنا تکبر و نخوت سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے کہ وہ جسے کچھ دیتا تھا اپنی خوشی سے بطور احسان دیتا تھا۔ لہٰذا انسان کی ہر وقت کوشش یہ رہتی تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح خدا کو خوش رکھے (انسانی بادشاہوں کی طرح) اسے خوش کرنے کے لئے کبھی اس کی شان میں حمد و ستائش کے قصیدے پڑھے جاتے تھے اور کبھی اس کے حضور گڑگڑا کر رحم کی درخواستیں گذاری جاتی تھیں۔ کبھی اس کی بارگاہ میں نذرانے پیش کئے جاتے تھے اور کبھی اسے قربانیوں سے خوش کیا جاتا تھا۔ پھر دنیاوی بادشاہوں کی طرح، خدا کا دربار بھی ہوتا تھا جس میں "مقربین" اس کے گرد و پیش بیٹھتے تھے۔ باہر، حاجب و دربان ہوتے تھے۔ لہٰذا عام انسان کے لئے اس تک براہِ راست پہنچنا ناممکن تھا۔ اسے، خدا تک اپنی بات پہنچانے کے لئے وسیلوں اور سفارشیوں کی تلاش کرنی پڑتی تھی۔ یہ سفارشی وہ مقرب تھے جو خدا کے دربار میں موجود رہتے تھے۔ ان کی سفارش سے عوام کے کام نکلتے تھے۔ عوام کو ان کی سفارش حاصل کرنے کے لئے بھی بہت کچھ کرنا پڑتا تھا۔ غرضیکہ اس قسم کا خدا اور اس کے یہ تمام مقربین، انسان کے لئے مستقل ھوّا بنے رہتے تھے۔

تم غور کرو سلیم! کہ اگر کسی ذی حس انسان کو اس قسم کے بادشاہ کے زیرِ حکومت چار دن بھی گذارنے پڑیں تو اسکے احساسِ انسانیت کا حشر کیا ہوگا؟ اور اگر اُسے اس دنیا کی پوری زندگی اور اس کے بعد کی زندگی دونوں اس قسم کے خدا کی حکومت میں بسر کرنی پڑیں جس میں ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہے کہ "اب چھری صیاد نے لی، اب قفس کا در کھلا"، تو اس میں اس کی کیفیت کیا ہوگی؟ یہ تھیں وہ ناقابلِ برداشت پتھر کی سلیں جن کے نیچے انسانیت دبی چلی آ رہی تھی۔ اور یہ تھیں وہ استخوان شکن زنجیریں جن میں انسان جکڑا ہوا تھا۔ رسالتِ محمدیہؐ نے آکر خدا کا ایسا تصوّر دیا جس سے مجبور و مقہور انسان ان تمام اغلال و سلاسل سے آزاد ہو کر شرفِ انسانیت سے ہم آغوش ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ بے شک خدا، لاانتہا قوتوں کا مالک اور اپنے ارادوں اور فیصلوں میں مختارِ مطلق ہے، لیکن اس نے نظم و نسق

---

[1] اس سے مراد وہ تصوّر ہے جو مذاہب میں رائج تھا ورنہ حضرات انبیائے کرامؑ نے خدا کا صحیح تصوّر ہی دیا تھا۔ اُن کی تعلیم میں تحریف کی وجہ سے یہ صحیح تصوّر باقی نہیں رہا تھا۔

کائنات اور انسانی سعی وعمل کے نتائج کے لئے ایسے اٹل قوانین بنا دیئے ہیں جن میں کہیں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا (۲۵/۲)۔ اس نے ہر شے کو پیدا کیا اور پھر اس کے لئے پیمانے مقرر کر دیئے۔ یہ "قدر" یا پیمانے ہی ہیں جنہیں دورِ حاضر کی اصطلاح میں قانون (LAW) کہا جاتا ہے (قانون یا LAW سے مراد وہ قانون نہیں جس کی عدالتوں میں مٹی پلید ہوتی ہے۔ بلکہ وہ قانون جس کے مطابق کارگہ کائنات اس حسن و خوبی سے چل رہا ہے)۔ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (۶۵/۳)۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ نے ہر شے کے لئے ایک قانون بنا دیا ہے لہذا یہاں کسی مستبد حاکم کی مطلق العنانی کارفرما نہیں۔ یہاں ہر کام قاعدے اور قانون اور آئین و دستور کے مطابق ہوتا ہے۔ جسے ہم "امر اللہ" یا خدا کا حکم کہتے ہیں، جب وہ عالمِ محسوسات میں کارفرما ہوتا ہے تو قوانین کی حدود میں محدود ہو جاتا ہے۔ وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا (۳۳/۳۸)۔ ظاہر ہے سلیم! جہاں ہر کام قانون کے مطابق سرانجام پاتا ہو وہاں نہ کسی کی خوشامد درآمد کی ضرورت ہوتی ہے، نہ رشوت اور نذرانے کی، وہاں نہ کسی وسیلے کی احتیاج ہوتی ہے نہ کسی سفارش کی تلاش، وہاں نہ کسی سے بے انصافی ہوتی ہے نہ کسی کی رو رعایت۔ اس اندازِ حکومت میں، لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنصَرُونَ (۲/۴۸)۔ یہاں یہ قانون بھی اس طرح نتیجہ خیز ہوتا ہے جس طرح سنکھیا کھانے سے ہلاکت اور پانی پینے سے پیاس کی تسکین ہو جاتی ہے۔ اس میں نہ کسی عدالت میں جانے کی ضرورت پڑتی ہے نہ کورٹ فیس لگانے کی حاجت، نہ گواہ بلانے کا مطالبہ ہوتا ہے نہ دستاویزیں پیش کرنے کا تقاضا۔ ادھر عمل سرزد ہوا، ادھر اس کا نتیجہ مرتب ہونا شروع ہو گیا۔

سوچو سلیم! کہ اس قسم کی فضا میں انسان کو کس قدر حریت اور آزادی نصیب ہوتی ہے اور اس کی پیشانی میں سربلندیوں اور سرفرازیوں کے کتنے عظیم عرش جھلک اٹھتے ہیں۔ اس میں قانون کی اطاعت کرنی ہوگی اور بس۔ اس میں کسی فرد کی غلامی اور محکومی کا سوال ہی نہیں ہوگا۔ نہ ہی وہ تذبذب اور اضطراب جو مستبد شہنشاہ قسم کے "خدا" کے تصور کے ماتحت ہر وقت سینۂ آدم میں آتشِ خاموش کی طرح سلگتا رہتا تھا کہ نہ معلوم وہ کس بات سے ناراض ہو جائے اور اس کا نتیجہ کیا ہو؟ اب ہر شے کے پیمانے مقرر ہیں۔ ان پیمانوں (قوانین) کا علم حاصل کیجئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ فلاں عمل کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اس کے بعد آپ کا ہر قدم حتم و یقین کے ساتھ اٹھے گا اس حتم و یقین کے ساتھ کہ دنیا خواہ ادھر سے ادھر ہو جائے جس قانون کا سررشتہ آپ نے تھاما ہے وہ کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ تمہیں سلیم! وہ رسے کا پل (ROPE-WAY) یاد ہے جس میں ہنگولا لٹکا کر اتنی گہری کھڈ کو عبور کیا کرتے جب وہ ہنگولا عین بیچ میں جاتا تھا اور نیچے کھڈ کا بھیانک اندھیرا نظر آتا تھا تو وہ سماں کس قدر ہولناک ہوتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود

ہم کس ہنسی خوشی سے ادھر سے اُدھر آیا جایا کرتے تھے۔ یہ اطمینان کس چیز سے حاصل تھا؟ صرف اس سے کہ اس کا رسّا اس قدر مضبوط ہے کہ وہ کبھی ٹوٹے گا نہیں۔ وہ درمیان میں جا کر دھوکا نہیں دیگا۔ بس ایسا ہی اطمینان اس قانون کی اطاعت سے ہوتا ہے جسکے متعلق یقین ہو کہ وہ کبھی دغا نہیں دے گا، کبھی ٹوٹے گا نہیں۔ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا (۲/۲۵۶)۔ جس نے ہر غیر خداوندی قانون سے منہ موڑ کر صرف "قانونِ خداوندی" پر بھروسہ کر لیا تو اس نے ایک مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ اور اس "قانون کی اطاعت" کبھی کسی تھانیدار کے حکم کی اطاعت نہیں بلکہ ایک ڈاکٹر کی ہدایات کی تعمیل ہے۔ جو ان ہدایات کی تعمیل کرے گا وہ بیماری سے محفوظ رہے گا۔ جو ان کے خلاف جائے گا، اس کی صحت تباہ ہو جائے گی۔ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲/۳۸)۔

کائنات میں قانون کی کارفرمائی کے تصوّر نے ہر قسم کی توہم پرستی کا خاتمہ کر دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات میں کوئی حادثہ یونہی ہنگامی طور پر رونما نہیں ہوتا بلکہ سلسلہ علت و معلول (CAUSE AND EFFECT) کے مطابق ہوتا ہے۔ اس حقیقت نے ہر ذہن کو دعوتِ غور و فکر دی اور اس طرح، خدا کے اس صحیح تصوّر سے سائنٹفک دور کا آغاز ہو گیا اور علمِ انسانی کے لئے تحقیق و کاوش کے لا انتہا راستے کھل گئے۔

تم نے دیکھا کہ خدا کے تصوّر میں اس بنیادی تبدیلی سے، رسالت محمدیہؐ نے انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا اور اس کے قلب و اذہان سے کس کس قسم کا بوجھ اتار کر اسے صحیح انسانیت کی آزادی عطا کر دی۔

مذہب کی دنیا میں خدا کے بعد رسولؐ کا درجہ آتا ہے۔ رسالتِ محمدیہؐ سے پہلے، اقوامِ عالم نے اپنے مذہب کے بانیوں کو انسانی سطح سے اٹھا کر، خدائی مسند پر بٹھا دیا تھا۔ ہندو اپنے رشیوں کو پرمیشور کا اوتار مانتے تھے، زرتشتیوں کا مینترا خود خدا مانا جاتا تھا، عیسائیوں نے حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا ہی نہیں بلکہ خدائی میں تیسرے حصّے کا شریک قرار دے رکھا تھا۔ علاوہ اس کے کہ یہ چیز علم و حقیقت کے خلاف تھی، ذہنِ انسانی پر اس کا اثر یہ تھا کہ لوگ سمجھتے تھے کہ وہ بڑے بڑے کارنامے جو ان بزرگوں سے سرزد ہوئے دوسرے انسانوں سے عمل میں نہیں آسکتے کیونکہ وہ مافوق البشر قوتوں کے حامل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ اقوام، اپنی نشاۃ ثانیہ (تازہ حیاتِ قومی) کے لئے کسی مافوق البشر "آنے والے" کا انتظار کرتی تھیں۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ کام ہم لوگوں سے ہو ہی نہیں سکتا۔ تم سمجھتے ہو سلیم! کہ اس عقیدہ کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہ تو ہیں فکر اور عمل دونوں اعتبار سے قامتِ انسانیت

—————— (HUMAN STATURE) تک پہنچ ہی نہ سکیں۔ ان کے اعصاب پر ہر وقت جذبۂ مرعوبیت (INFERIORITY COMPLEX) سوار رہتا تھا جو ان کے مضمر جوہروں ہی بالیدگی پیدا نہیں ہونے دیتا تھا۔

رسالتِ محمدیہؐ نے آکر اعلان کیا کہ "اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ" اس خصوصیت کو چھوڑ کر نبی کو خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے، وہ تمہارے ہی جیسا انسان ہوتا ہے۔ لہٰذا وحی کے مطابق جو انقلاب اس نے برپا کیا تھا وہ تم بھی کر سکتے ہو۔ اس کے لئے کسی مافوق البشر قوت و استعداد کی ضرورت نہیں۔ رسولؐ کی زندگی تمہارے لئے اس اعتبار سے نمونہ بنتی ہے کہ جو کچھ اس نے کیا تھا وہ تمہارے لئے ناممکن الحصول یا ناممکن العمل نہیں۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ رسولؐ کے تصوّر میں اس تبدیلی نے انسان کو زمین کی پستیوں سے اٹھا کر کس طرح آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا؟ لیکن رسالتِ محمدیہؐ تو اس سے بھی ایک قدم آگے چلی گئی۔ اس سے پہلے انسان اپنے عہدِ طفولیت میں تھا جہاں اسے قدم قدم پر کسی انگلی پکڑنے والے کے سہارے کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس دور میں انبیاءؑ کا سلسلہ پیہم و متواتر جاری رہا۔ لیکن رسالتِ محمدیہؐ نے اعلان کر دیا کہ اب سلسلۂ نبوّت ختم ہو گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اب انسانوں کو اپنے معاملات کے فیصلے آپ کرنے ہوں گے۔ صرف یہ دیکھنا ہوگا کہ ان کا کوئی فیصلہ ان غیر متبدل اصولوں کے خلاف نہ جائے جو وحی نے عطا کئے ہیں اور جو اب قرآن کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ جیسا کہ ایک سابقہ خط میں بتایا جا چکا ہے۔ انسانیت کی تاریخ میں ختمِ نبوت کا اعلان ایک بہت بڑا انقلاب ہے۔ اس سے انسانی تاریخ میں نئے دور کا آغاز ہوتا ہے اور یہ اعلان (معاذ اللہ) کسی منکرِ نبوّت کی طرف سے نہیں ہوا۔ ختمِ نبوت کا اعلان خود زبانِ نبوت سے ہوا ہے۔ یہ اعلان ہے اس حقیقت کا کہ اب انسان، سنِ شعور کو پہنچ گیا ہے اور اسے صرف اتنی راہنمائی کی ضرورت ہے کہ ہر دوراہے پر معلوم ہو جائے کہ یہ راستہ کس طرف جاتا ہے اور وہ راستہ کس سمت کو۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ رسالتِ محمدیہؐ نے اس باب میں کس قدر حریتِ فکر و عمل اور خود اعتمادی و خود فیصلگی کی صلاحیت عطا کی ہے۔

مذہب کی دنیا میں تیسری چٹان، بازنجیر در زنجیر کیا پورے کا پورا جیل خانہ، پیشوائیت کی لعنت ہے۔ (وہی جسے انگریزی میں (PRIESTHOOD)، ہندوؤں کے ہاں برہمنیت، اور ہمارے ہاں ملائیت کہا جاتا ہے) یہ زنجیریں وہ ہیں جو انسان کو ایک قدم بھی اپنی مرضی سے اٹھانے نہیں دیتیں۔ یوں بیٹھو، یوں اٹھو، یوں سوؤ، یوں جاگو، یوں چلو، یوں پھرو، یوں کھاؤ، یوں پیو، دایاں پاؤں ادھر رکھو بایاں ادھر، سیدھا ہاتھ یوں اٹھاؤ الٹا یوں۔ پوری

کی پوری زندگی ایک مستبد ڈکٹیٹر کی (REGIMENTATION) بنا دی جاتی ہے۔ سوچو سلیم! کہ انسانیت پر یہ بوجھ کس قدر گراں اور یہ زنجیریں کیسی استخواں شکن تھیں۔ رسالت محمدیہؐ نے ان تمام زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا اور کہہ دیا کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ہو سکتی۔ قانون کی اطاعت میں پیشوائیت کا کیا کام؟ اس سے آگے بڑھئے۔ مذہب کی دنیا میں "نجات" کا تصوّر سامنے آتا ہے۔ اسے درحقیقت مذہب کا مقصود و منتہیٰ قرار دیا جاتا ہے۔ خود لفظ "نجات" اس کی غمازی کرتا ہے کہ انسان کسی جیل خانے میں محبوس یا سخت زنجیروں میں مقید ہے اور ان زنجیروں سے رہائی حاصل کرنا نجات ہے۔ رسالت محمدیہؐ نے اس کا اعلان کیا کہ نجات کا یہ تصوّر غلط ہے۔ انسان کسی مصیبت میں گرفتار نہیں کہ اسے اس سے نجات دلائی جائے۔ اسے کچھ قوتیں اور صلاحیتیں دی گئی ہیں اور ممکنات کی ایک وسیع دنیا اس کے سامنے رکھ دی گئی ہے۔ اس کے بعد اس سے کہہ دیا گیا ہے یہ اپنی سعی و عمل سے جو کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے، کرے۔ جو جس قدر متاع حاصل کرے گا، اتنا ہی کامیاب و کامران ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے زندگی کا مقصود نجات کی بجائے فلاح و فوز قرار دیا ہے۔ فلاح کے معنی ہیں کھیتی کا پروان چڑھنا۔ محنتوں کا ثمر بار ہونا، اور فوز کے معنی ہیں (ACHIEVEMENT)۔ ان صلاحیتوں کی نشوونما جن سے زندگی اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جائے۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ رسالت محمدیہؐ نے بیک جنبش ان محکم زنجیروں کو کس طرح تارِ عنکبوت بنا کر رکھ دیا!

مذہب کی دنیا سے آگے بڑھ کر معاملات کی دنیا میں آئیے تو ملوکیت کا استبداد، نوعِ انسان کے سر پر ہمالیہ سے زیادہ گراں بار پہاڑ تھا جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ رسالت محمدیہؐ نے نوعِ انسان کو یہ انقلاب آفریں پیغام دیا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ انسانوں کو اپنے معاملات قوانین خداوندی کی روشنی میں باہمی مشاورت سے طے کرنے چاہئیں۔ جو ان میں سے اُن قوانین و ضوابط کی نگہداشت سب سے زیادہ کرتا ہے وہ ان میں سب سے زیادہ واجب التکریم ہے۔ لیکن حقِ حکومت اسے بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ خود نبی کو بھی نہیں۔

ملوکیت کی غلامی سے بھی زیادہ کرب انگیز اور انسانیت سوز غلامی، اقتصادی غلامی (ECONOMIC SLAVERY) ہے۔ نوعِ انسانی اس قدر مدت مدید سے اس غلامی میں ماخوذ چلی آرہی تھی کہ غلاموں کو اپنی غلامی کا احساس تک بھی باقی نہیں رہا تھا۔ رسالت محمدیہؐ نے آکر اعلان کیا کہ خدا نے زمین کے دستر خوان پر رزق کو اس لئے بکھیر رکھا ہے کہ اس سے تمام نوعِ انسان کی پرورش ہو سکے۔ لہٰذا کسی فرد کو یہ حق حاصل نہیں کہ رزق کے سرچشموں پر

ذاتی قبضہ جمالے۔ یہ معاشرے کی تحویل میں رہنے چاہییں اور معاشرے کو تمام افراد کی ضروریات زندگی کا کفیل ہونا چاہیئے۔

اس مقام پر سلیم! ممکن ہے تمہارے دل میں ایک سوال پیدا ہو جس کا جواب ضروری ہے۔ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جب کوئی قوم رزق کی طرف سے مطمئن ہو جائے تو اس کے قوائے عملیہ مفلوج ہو جاتے ہیں اور وہ رفتہ رفتہ زندگی کی حرارت سے محروم ہو جاتی ہے۔ اگر قرآنی نظام کے ماتحت، افرادِ معاشرہ کو حصول رزق کی کشمکش سے نجات دلا دی جائے تو کیا ان کی بھی یہی حالت نہ ہو جائے گی؟ یہ اعتراض بڑا معقول نظر آتا ہے اور تاریخ اقوام انسان کو اسی نتیجہ پر پہنچاتی ہے۔ لیکن سلیم! اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان نے اپنی زندگی کا مقصود صرف حصولِ رزق قرار دے رکھا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی حیاتِ طبیعی کا نام ہے اور جب اسے اس زندگی کی بقا کا سامان (رزق) میسّر آجائے تو اس کے بعد اس کے سامنے کوئی ایسا مقصد نہیں رہ جاتا جس کے حصول کے لئے جد و جہد کرنی پڑے۔ یہ وجہ ہے کہ جب کوئی قوم رزق کی طرف سے مطمئن ہو جاتی ہے تو اس کی قوتوں میں اضمحلال شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن قرآن نے طبیعی زندگی کو محض حیوانی سطح کی زندگی قرار دیا ہے۔ اس لئے یہ مقصود و منتہائے انسانیت نہیں۔ اس نے انسان کے سامنے اس سے کہیں بلند اور وسیع مقاصد رکھے ہیں (ان کی تفصیل مختلف مواقع پر بتا چکا ہوں اس لئے ان کے دُہرانے کی یہاں ضرورت نہیں)۔ قرآن نے یہ دیکھا کہ انسان کی یہ کس قدر بدنصیبی ہے کہ اسکی ساری توانائیاں محض حصول رزق میں ضائع ہو جاتی ہیں اور وہ ان سے بلند مقاصد کی طرف توجہ ہی نہیں دے سکتا۔ اس نے اسے روٹی کی طرف سے مطمئن کر کے اس کی تمام توانائیوں کو اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے محفوظ (CONSERVE) کر لیا اور اس سے کہہ دیا کہ وہ اپنی تمام توجہات کو ان مقاصد پر مرکوز کر دے اور اس طرح "اقطار السموٰت وَالارض" سے آگے نکل جانے کی کوشش کرے۔ ذرا غور کرو سلیم! کہ رسالت محمدیہؐ نے اس ایک تبدیلی سے عالم انسانیت میں کتنا بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔ اس نے انسان کی تمام توانائیوں کو جو حصول رزق جیسے اسفل مقصد ہی میں ضائع ہو جاتی تھیں، محفوظ کر لیا۔ لیکن رزق کی طرف سے اطمینان ہو جانے سے انسان میں جو تعطّل پیدا ہو جاتا تھا اس کے سامنے بلند ترین مقاصد رکھ کر نہ صرف اس تعطّل کو دور کر دیا، بلکہ اس کی زندگی کو جہادِ مسلسل میں تبدیل کر دیا۔ ایسے مسلسل جہاد میں، کہ جاتے والی نسل جس حد تک راستہ طے کر جائے آنے والی نسل کے لئے وہ مقام سفر کا نقطۂ آغاز بن جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ماضی کی طرف نگاہ رکھنے کی بجائے ہمیشہ مستقبل کو سامنے رکھنے کی تاکید کرتا ہے۔ اسی کا نام ایمان بالآخرت ہے اور یہ بجائے خویش بہت بڑا انقلاب ہے جسے رسالت محمدیہؐ نے

انسانی نگاہ میں پیدا کیا ہے۔ یعنی ہمیشہ نگاہ مستقبل پر رکھنی۔ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۔ اِس زندگی میں بھی مستقبل پر اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی۔

خط لمبا ہو گیا ہے لیکن اسے ختم کرنے سے پہلے میں اس خصوصیتِ کبریٰ کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں جو میرے نزدیک رسالت محمدیہؐ کا نوع انسانی پر احسان عظیم ہے۔ تم غور کرو کہ انسان اپنی طبعی دُنیا میں نسلاً بعد نسلٍ ترقی کرتا ہوا کس طرح آگے بڑھتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ مثال کے طور پر امراض اور ان کے علاج کے شعبہ ہی کو دیکھو۔ جن امراض کو آج سے چند صدیاں پہلے لاعلاج سمجھا جاتا تھا (بلکہ یہ بھی معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ امراض ہیں کیا) ان پر انسان کس طرح قابو پاتا چلا جا رہا ہے۔ پھر طریق علاج پر غور کرو۔ ابھی پچاس سال پہلے دانت نکلوانا اس قدر کرب انگیز تھا کہ آج اس کے تصور سے کپکپی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن آج ایک دانت تو کیا، پورے کا پورا جبڑا اس طرح نکال کر رکھ دیا جاتا ہے کہ آدمی کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ یہ کب ہو گیا۔ اسی طرح سرجری (جراحی) کی دوسری مثالوں کو سمجھ لو۔ اب تم غور کرو کہ پچھلی صدی کے انسان کے لئے یہ تصور کس قدر یاس انگیز اور حسرت ناک ہو گا کہ میں یونہی سو سال پہلے پیدا ہو گیا۔ اگر میں بھی بیسویں صدی میں پیدا ہوتا تو اس تمام کرب و درد سے بچ جاتا جس میں مختلف امراض اور ان کے علاج کی وجہ سے مبتلا رہا۔ یہ اس لئے ہے سلیم! کہ انسانی عقل کا طریق تجرباتی ہے۔ وہ مختلف تجارب کے بعد رفتہ رفتہ انکشافِ حقائق کرتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ اس باب میں سابقہ نسل کا انسان، آنے والی نسل کی سطح سے پیچھے رہ جاتا ہے۔ یہ اس کی بے بسی ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔

لیکن وحی کا طریق تجرباتی نہیں۔ اس کی رو سے وہ تمام حقائق جو انسانیت کی نشو و نما کے لئے ضروری ہیں، بیک وقت نوع انسانی پر (نبی کے ذریعے) منکشف کر دیئے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سابقہ اور موجودہ اور آنے والی نسل کے تمام انسان ایک ہی سطح پر ہوتے ہیں۔ اس میں کسی گزشتہ نسل کے انسان کو اس کا افسوس نہیں ہوتا کہ وہ آنے والی نسل سے پہلے کیوں پیدا ہو گیا؟ وہ بھی اسی مقام پر ہوتا ہے جس مقام پر آنے والی نسل کے انسان نے ہونا ہے۔ لہٰذا اس میں کسی دور کے انسان کے لئے وجۂ مایوسی اور احساس بے بسی نہیں ہوتا۔ وحی کی رو سے عطا فرمودہ پروگرام سب کے لئے یکساں طور پر باعث رحمت ہوتا ہے۔ جو قوم جس دور میں بھی اسے اختیار کرے اس کے سامنے وہی نتائج آ جاتے ہیں۔ چونکہ یہ پروگرام رسالتِ محمدیہؐ میں تکمیل تک پہنچ گیا اور ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا گیا اس لئے رسالتِ محمدیہؐ تمام نوع انسانی کے لئے رحمت ہے۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ کا مفہوم یہی ہے۔

کیوں سلیم! کتنا بڑا ہے یہ احسان؟ اس کی سپاس گزاری میں تمام نوعِ انسانی کی گردن اس رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡن کے حضور جھکنی چاہیئے یا نہیں؟ اب تم سمجھے کہ میں اس تقریب عظیم کو کیوں تمام دنیا کے انسانوں کیلئے سب سے بڑا جشن مسرت قرار دیتا ہوں؟ سلیم! دنیا نے ابھی تک رسالت محمدیہؐ کی غایت و مقصود کو سمجھا ہی نہیں۔ لیکن اس میں دنیا والوں کا کیا قصور؟ ہم انہیں سمجھاتے تو وہ سمجھتے!

اور اس کے جواب میں تم کہدوگے کہ اس میں ہمارا بھی کیا قصور؟ ہم خود سمجھتے تو دوسروں کو بھی سمجھاتے!

بہرحال اب تو تم سمجھ گئے کہ رسالت محمدیہؐ کس طرح رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡن ہے؟ اس نکتہ کی مزید تشریح دوسرے خط میں کی جائے گی۔ و بیدہٖ التوفیق۔

والسّلام

پرویز

اکتوبر ۱۹۵۵ء